انتظار حسین کی ناول نگاری میں ناسٹیلجیائی عناصر

شکیلہ جبیں

Shakila Jabeen

Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Govt. College Women University, Faisalabad.

پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ یوسف

Prof. Dr. Shahida Yousuf

Department of Urdu,
Govt. College Women University, Faisalabad.

Abstract:

Nostalgia is Psychiatric propensity that is associated to yearning for the past. For the first time, Johannes Hofer (1669-1752) introduced this word Nostalgia for home sickness especially for "Swiss homesickness". In Urdu literature, echoes of nostalgia is more prominent in fiction mainly in novel-writing like 'Aisi Bulandi Aisi Pasti' by Aziz Ahmad , Aag ka Darya' by Qurat-ul-Ain Haider, 'Angan' by Khadija Mastoor ,and 'Raja Gidh' by Bano Qudsia. During ninteenth century particularly in reference to 'Independence Movement', there is another seasoning of excessive sentimental yearning of past. To face quite different environment after separation develops distinctive feature of nostaligia in urdu literature. Intizar Hussain is widely recognised as a leading literary figure in Urdu, chiefly his three novel 'Basti,(1980), 'Tazkira' (1987). Aage Samandar Ha' (1995). Basti, recived global prize. Nostalgic feelings are more vived in Basti that apparently presents the separation of East Pakistan but it sheds light on tragic circumstances and its miserable results. While his novel Tazkira(1987) is an amalgamation of past, present and future confluence.

ناسٹلجیا ایک نفسیاتی رجحان ہے، جس کو ماضی کے شدید احساس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ناسٹلجیا کا لفظ پہلی بار مرتبہ جونس ہافر(JOHANSESS HOFER) نے وطن کی خواہش یا گھر کی یاد (Home sickness) کے طور پر متعارف کروایا ۔ پہلے پہل ناسٹلجیا اُن سپاہیوں کی وطن جانے کی خواہش کے حوالے سے ماضی میں ایک بیماری تصور کی جاتی تھی، جو دل شکستگی اور اُداسی کا شکار ہو جاتے تھے۔ لیکن اب یہ کوئی بیماری نہیں، بلکہ ماضی کے خوشگوار لمحوں کی یاد کا استعارہ ہے۔ قاضی جاوید اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورت حال کی ناگواری کا مداوا کر سکے۔''(۱)

''یاد'' انفرادی شخصیت کی بنیاد ہے، کیوں کہ اگر یادداشت نہ ہو تو ماضی کہاں رہتا ہے؟ وہ ماضی جو جڑوں اور بنیادوں کا خوبصورت استعارہ ہے اور ماضی کے بغیر خود حال و مستقبل کی اہمیت ایک اُڑتے ہوئے غبار سے زیادہ نہیں ہے جس میں سوائے گرد کے طوفان کے کچھ دکھائی نہیں دیتا چنانچہ یاد کے معنی ہیں: ''اپنی ذات کو ایک تہذیبی انفرادیت کا عزت و وقار بخشنا ۔ ماضی کوئی مردہ، گمشدہ یا بے مصرف شے نہیں ہے۔ بلکہ حال و مستقبل کے روشن امکانات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ گویا ماضی، حال اور مستقبل تینوں اجزا ایک ہی سلسلے سے وابستہ ہیں۔ بقول انتظار حسین:

> ''حافظہ نہ ہو تو ماضی کا عرفان کیا ہے اور ماضی کا عرفان نہ ہو تو حال و مستقبل کی حد بندی کیا یہ عمل ظاہر ہے محض ایک غیر محدود، بے نام و نشان سے حال میں زیست کرنے سے جاری ہو سکتا ہے نہ حاصل ۔ بدقسمتی کہہ لیجیے کہ ترقی پسند تحریک کے ذریعے اردو ادب میں سماجی حقیقت پسندی کی بے جا مداخلت کے سبب اردو کا افسانوی ادب اگست ۱۹۴۷ء تک ایک ایسا ادب رہا ہے، جو خود اپنی روایت سے باغی اور گریزاں ہے"(۲)

قیامِ پاکستان کے عمل نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف ایک سمت، حال و مستقبل کا پتہ دیا بلکہ، ماضی کو کھوجنے اپنے احساسات کا حصہ بنانے اور سمجھنے کی خواہش بھی دی، چنانچہ ادب میں پہلی بار قوم پرستی، حب الوطنی اور معاشرتی اصلاح کے موضوعات در آئے اور اس کے ساتھ ایک بالکل انوکھا موضوع یا رجحان بھی، جس کو ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔ اس رجحان کی بنیاد ہجرت کے تجربے پر تھی۔ ہجرت کے بعد یہ احساس شدت سے ان ادبا کے ہاں (جو خاص طور پر ہجرت کر کے آئے تھے، در آیا جن کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ گیا تھا:

> ''ناسٹلجیا کا مفہوم غالباً ہمارے یہاں ''اداسی'' سے لیا جاتا ہے جو یکسر غلط ہے۔ خانہ اداسی سے مراد Homesickness ہے نہ کہ ناسٹلجیا جو بظاہر لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے حقیقتاً دو یونانی الفاظ Nostos بمعنی ''واپسی'' اور Algos جس کے معنی ''درد'' ہیں۔۔۔ سے مل کر بنا ہے لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی ''درد آلود واپسی'' ہوگا اس اعتبار سے لفظ ناسٹلجیا کو ہم ''پس کربیہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ کرب ماضی کی جانب واپسی سے مشروط و منسوب ہے۔''(۳)

ناسٹلجیا یا پس کربیہ سے مراد، ہمارے وہ عواطف ہیں، جو ماضی ہیں؛ مگر پس کربیہ کی لفظی تشریح ناکامی ہے، کیوں کہ

پس کر بہ میں دکھ اور درد و غم ہی نہیں، بلکہ فرحت اور مسرت کے جذبات بھی حاصل ہوتے ہیں؛ اس سے تربیتی کیفیت بھی مل سکتی ہے۔ وہ ادیب، شاعر جنھوں نے برصغیر کی تقسیم اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ انہوں نے اس علاقے میں سیاسی اور مذہبی طور پر پیدا ہونے والی انسانی صورت حال کی کرب انگیزی کو محسوس کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ سے پہلے اردو ادب میں قصے کہانیاں اور داستانیں عام تھیں لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اس اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس نے صرف سیاسی انقلاب ہی برپا نہیں کیا: بلکہ سماجی اور اخلاقی قدروں کے معیار میں بھی تبدیلی آئی، جس سے ادب بھی متاثر ہوا۔ جنگ آزادی نے ہم پر یہ بات واضح کر دی کہ ہماری سب سے بڑی کمزوری زندگی سے دوری ہے۔ اس شعور کے آتے ہی زندگی کے ہر شعبے میں اصطلاحات کی ابتداء ہوگئی۔ اس اعتبار سے اردو فکشن کی تاریخ میں انیسویں صدی، سیاسی و تہذیبی کروڑوں کی صدی ہے۔ یہ دور برصغیر کی ادبی و فکری تاریخ کے لیے غیر معمولی دور تھا۔

ناسٹلجیا کا ذکر کسی نہ کسی طور پر ادب کی ہر صنف میں خواہ نثر ہو یا شاعری موجود ہے، کیونکہ انسان ماضی سے کٹ نہیں سکتا، اسی لیے ناسٹلجیا کا در آنا ضروری ہے۔ ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے جانے والے نمائندہ ناولوں میں انتظار حسین کا ''بستی''، ''تذکرہ'' اور ''آگے سمندر ہے'' عزیز احمد کا ''ایسی بلندی ایسی پستی''، الطاف فاطمہ کا ''نشان منزل''، قراۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا''، خدیجہ مستور کا ''آنگن''، صدیق سالک کا ''پریشر ککر''، بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ''، خالدہ حسین کا ''کاغذی گھاٹ''، انیس ناگی کا ''دیوار کے پیچھے'' اور طارق محمود کا ''اللہ میگھ دے'' وغیرہ اہم ہیں۔

ناسٹلجیائی رجحان کے بارے میں بقول قراۃ العین حیدر یوں تو سارا ادب ہی ناسٹلجیا کی پیداوار ہے تاہم تقسیم ہند کے سانحے نے اردو ادب پر اپنے دور رس اثرات مرتب کیے۔ قیام پاکستان ہی ایسا لمحہ تھا، جب اس خطے کی عوام ارضی پیوستگی کے شدید احساس کے تحت بے زمینی، عدم تحفظ اور عدم تشخص کی صورت میں زمانی و مکانی شعور کے ایک لرزہ خیز تجربے سے گزرے، جو نہ صرف ان کے لیے بلکہ ادب کے لیے بھی نیا تھا۔ آبادی کا اتنا بڑا گروہ کبھی بھی اس سے پہلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا جتنا تقسیم ہند کے نتیجے میں ہوا۔ یہ سانحہ اتنا بڑا تھا کہ لوگوں کے حواس برقرار نہ رہے اور جب انھیں حالات کا شعور حاصل ہوا تو دنیا بدل چکی تھی، چنانچہ ترک وطن کرنے والی اُس نسل کے ہاں ناسٹلجیا پوری شدت سے اُبھرا۔ زمین سے بے دخلی کا احساس فرد کی شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ بے دخلی محض زمین سے رشتہ نہیں توڑتی بلکہ ایک پوری تہذیب اپنی اقدار، اپنے ماحول سے کٹ جاتی ہے۔ اس لیے ادب نے اُس احساس کو جو اپنی زمین اور تہذیب سے کٹ جانے کے باعث پیدا ہوتا ہے، اپنا موضوع بنایا ہے۔

ادب میں تحریک آزادی کے حوالے سے انیسویں صدی دہائی تک آتے ہم ایک نئے ذائقے سے روشناس ہوتے ہیں، جس کی دوسری شکل کو ایک فکری جہت بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ جہت ناسٹلجیا سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں مسئلہ اس غارت گری کا نہیں جو تحریک آزادی کے بعد ان لوگوں کا ذہنی سرمایہ ہے جو لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کر کے آئے، ایک جمے ہوئے ماحول سے اُٹھ کر دوسرے ماحول میں آجانا فطری طور پر ناسٹلجیا یا غریب الوطنی کے احساس کو بے ساختہ جنم دیتا ہے۔ کیونکہ یہ فطرتِ انسانی ہے سرکارِ دو عالم ﷺ مدینہ میں مکہ کو یاد کیا کرتے تھے۔ یہی کیفیت ہمیں ادب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس اعتبار سے خاص طور پر انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا نام لیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے روبینہ الماس کا کہنا ہے:

''ماضی کی باز آفرینی کا شدت سے استعمال قرۃ العین حیدر، اور انتظار حسین کے یہاں ملتا

ہے۔''(۴)

انتظار حسین کے ہاں ماضی پرستی ایک ایسا عنصر ہے جو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر انتظار حسین کے ناولوں کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ناول ناسٹلجیا کے مشترک تھیم میں شعوری کوشش سے باندھے گئے ہیں کیوں کہ انتظار حسین خود کو ماضی کی تاریخ سے جوڑے رکھنے کے خواہاں ہیں اور ان کے ناول ۱۹۴۷ء میں کی جانے والی ہجرت کے تسلسل میں لکھی گئی تحریریں ہیں، جہاں پرانی بستیوں، روایتوں اور تہذیبوں سے بچھڑنے کا دکھ ہے تو ساتھ ہی ساتھ نئی جگہ آباد ہونے کی لگن اور نئے خوابوں کی تعبیر کا جہاں ہے جو تعبیر سے پہلے گہنا گئے، اور ملک کی سیاسی بدحالی اور آمریت کا شکار ہو کے دولخت ہو گیا۔ عوام ان سب مسائل سے کس طرح متاثر ہوئے کیسے ان کا مقابلہ کرتے ہیں انتظار حسین کے ناول انھی مسائل کو پیش کرتے ہیں۔

انتظار حسین کا ناول ''بستی'' بجا طور پر ایک شاہکار ناول ہے، یہ ناول ان کی پختگی کے دور میں سے ایک ہے۔ ان کے تین ناول ''بستی''، ''آگے سمندر ہے''، ''تذکرہ'' موضوعات، فنی کامیابی اور ادبی مقام و مرتبے کے اعتبار سے اگرچہ خاصے مختلف ہیں، لیکن ان تینوں میں ایک بات مشترکہ ہے کہ یہ تینوں کسی قومی آشوب کی پیداوار ہیں۔ مصنف نے انھیں کسی اجتماعی بحران کے زمانے میں محسوس کیا اور ان واقعات کے نتیجے میں اپنے محسوسات کو تحریر کرنا شروع کیا۔ قومی اور اجتماعی زندگی سے تعلق انتظار حسین کے ناولوں کی نمایاں خوبی ہے۔ ڈاکٹر آصف فرخی سے "بستی" کے بارے میں ایک گفتگو کے دوران انھوں نے کہا:

> ''ناولوں کا معاملہ عجیب ہے کہ جو بھی ناول میں نے شروع کیا وہ کوئی ہمارے ملک کی Immediate socio political situation تھی کوئی ایسا آشوب ہمارے ملک کا جو ہم پر گزر رہا ہے اور جس نے مجھ پر اثر کیا اور اس کے ردعمل میں یا جواب میں، میں نے قلم اُٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔''(۵)

ایک یاد کے طور پر ''بستی'' انتظار حسین کے پورے نظامِ بازیافت میں سب سے زیادہ روشن شے ہے اور ایک تجربے کے طور پر اپنی گہرائی کی جہت میں ''بستی'' ایک تاریک براعظم ہے، جسے انتظار حسین بار بار مختلف جہتوں سے دریافت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس لیے تو یاد کی روشنی اور تجربے کی گہرائی مل کر بار بار پھسل بھی جاتی ہیں اپنی بستی کی حیثیت انتظار حسین کے لیے مرکز کی سی ہے اور اس جگہ انسانی حوالے سے زمین اور زبان کا تعلق قائم ہوتا ہے چنانچہ ان کے ہاں بستی سے ہجرت کے معنی ہیں اپنے وجود کے مرکز سے ہجرت کرنا اور وقت کے ایک آہنگ سے دوسرے آہنگ کی طرف سفر کرنا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان سے اپنے ایک مکالمے میں انتظار حسین نے اپنی بستی کو کچھ ان الفاظ میں یاد کیا ہے:

> ''علی گڑھ کے قریب بلند شہر کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی ڈبائی۔ میں اس بستی میں پیدا ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں دس گیارہ سال کی عمر تک اس بستی میں رہا ہوں۔ وہ تو دس سال تھے یا گیارہ سال مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ ایک پوری صدی تھی وہ علاقہ، وہ چھوٹی سی زمین، وہ بستی، اس کے باہر کے چھوٹے چھوٹے دیہات جہاں میں کبھی کبھی یکے پر بیٹھ کر جاتا تھا اور کبھی بیل گاڑی میں، ان سب چیزوں کو دھیان میں لاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ چھوٹی سی زمین پورا براعظم تھی۔ خواب میں اس بستی کی کس کس چیز کا ذکر کروں۔''(۶)

ہجرت انتظار حسین کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اور اسی ہجرت کے حوالے سے ایک نفسیاتی رجحان ناسٹلجیا ہے، جسے بعض لوگ

ایک مریضانہ عمل قرار دیتے ہیں۔لیکن اس کی معنویت کا طلسم اس وقت کھلتا ہے جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ یادانفرادی شخصیت کی بنیاد ہے۔یاداشت نہ ہوتو پھر ماضی کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ ماضی جو جڑوں اور بنیاد کا استعارہ ہے۔انتظار حسین کی زندگی کے معاصر کے بارے میں تجربہ شہری زندگی کے ایک حصے تک ہی محدود ہے لیکن وہ اسی ایک حصے کو بار بار اپنے بچپن اور جوانی سے ٹکرا کر دیکھتے ہیں اور اس تصویری تصادم سے ہی ان کا ناول، داستانیں، اور افسانے جنم لیتے ہیں مگر ان کا طرزِ بیان اسلوبِ تحریر ہی نہیں، اسلوبِ نظر بھی ہے ۔

انتظار حسین کی ابتدائی تخلیقات میں زیادہ تر اسی اُجڑی دنیا کو آباد کرنے کی تمنا ہے جو برصغیر کی تقسیم کے بعد اُجڑ گئی تھی۔انتظار حسین کا ناول ''چاند گہن'' بھی ان کی ابتدائی تخلیقات میں سے ہے جو معاشرتی، مذہبی، لسانی، تاریخی تہذیبی علامتوں کا بھرپور اظہار ہے جس میں چاند گہن علائم وسیع کائناتی تناظر میں ظاہر ہوتی ہیں۔۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد اُجڑنے بچھڑنے والے لوگوں نے جس طرح دوبارہ زندگی شروع کی ''چاند گہن'' اسی پس منظر کی یادگار ہے۔ ہندو مسلم دونوں تہذیبوں میں ''چاند گہن'' اساطیری اہمیت کا حامل ہے اس لیے یہ نام دونوں تہذیبوں میں اپنے مخصوص معنی رکھتا ہے لیکن انتظار حسین نے اسے جس انداز میں استعمال کیا ہے وہ ہندو مسلم قوم کی تہذیبی زندگیوں، روایات، اقدار کے زوال کی داستان ہے جو غدر سے شروع ہو کر ۴۷ء کی تقسیم تک کے عرصے کو بیان کرتی ہے۔

اس ناول کے کردار توہم پرستی کا شکار ہیں جو اپنی اصل دنیا سے کٹ چکے ہیں ان کا رشتہ اپنے معاشرے سے منقطع ہو چکا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھے ہیں۔اپنی پہچان بھول کے صرف آنے والے کل کی فکر ہے مستقبل کا خوف ہی لاحق ہے اس بات کا اظہار ناول کے کردار بوجی، سبطین، علن وغیرہ کرتے ہیں۔

ناسٹلجیا کی خصوصیت پچھلی تحریروں سے کہیں زیادہ ان کے ناول ''بستی'' میں مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔یہ گہرائی اس کے ماضی سے پیدا ہوئی ہے۔مگر اب یہ ماضی ایک ایسا تاریخی شعور بن چکا ہے، جو زمان ومکان دونوں کے آر پار دیکھ سکتا ہے۔اور اس کی بنا پر دونوں کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اور دونوں میں سے کسی ایک سے خوف زدہ نہیں۔وہ ماضی کی روح سے خائف نہیں ہیں۔بظاہر ''بستی'' کا موضوع مشرقی پاکستان کا المیہ ہے۔دراصل یہ شکست وریخت کی ایک ایسی اندوہ ناک داستان ہے، جس نے شہروں، بستیوں، اور انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔حالات وواقعات کا سیلابی ریلا ان کو اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا ہے۔کہانی تو اس ناول کی بہت مختصر ہے انتظار حسین کو روایتی معنوں میں کہانی لکھنے کے فن سے کچھ علاقہ بھی نہیں اور نہ ہی کردار سازی سے کچھ ایسی دلچسپی ہے۔اس ناول میں تو ان کا مقصد شکست وریخت کی ایک فضا تیار کرنا ہے۔ جہاں کردار سایوں کی طرح چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔حالات کے اتار چڑھاؤ کے نتیجے میں خود ان کے اندر تبدیلیوں کا سراغ بہت کم ملتا ہے ، یہ روز وشب کے چکر میں جکڑے رہنے کی وجہ سے حالات وواقعات کی جنگ سے ہار کر زندگی کے سامنے ہتھیار پھینک دیتے ہیں اور آسمان سے کس ''بشارت'' کے منتظر ہیں۔''بستی'' کا آغاز بچپن سے ہوتا ہے۔روپ نگر نام کی بستی جہاں دنیا مانوس ہے اور دریافت کی منتظر مختلف موقعوں پر ماضی یاد آتا ہے اور ایک مرتب اور مربوط تصویر بناتا ہے، مگر اپنے گزر جانے کے بعد کسی دوسری بستی میں جا گزیں ہونے والوں کے لیے ہندوستان سے ہجرت، قیام پاکستان، نوعمری کے جذبے اور اُمنگیں، لاہور میں ایک نئے شہر کے طور پر آن بسنے کی کیفیت اور مرکزی کردار ذاکر کا اس شہر کے دانش ور حلقوں میں اُٹھنا بیٹھنا جو شیراز میں جمع ہوتے ہیں یہ ناول لہریں لیتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور حلقہ در حلقہ پھیلتا جاتا ہے۔

۱۔ ہبوطِ آدم کا لمحہ
۲۔ ہند اسلامی تہذیب کا زمانہ
۳۔ آریائی وقت
۴۔ اسلامی تاریخ میں وقت کی جہت
۵۔ عام زندگی میں وقت کا بہاؤ

وقت کی یہ پانچ سطحیں مختلف کیفیتوں میں ایک دوسرے سے قریب آتی اور دور جاتی ہیں۔ روپ نگر وہ جگہ ہے جہاں وقت کی پانچوں پرتیں مرتکز ہیں اور بستی کی تہ دار معنویت بھی یہی ہیں۔ وقت کی ان پانچ سطحوں کے لیے انتظار حسین نے پانچ ہی لینڈ سکیپ بھی لیے ہیں۔

۱۔ کائنات
۲۔ روپ نگر
۳۔ مشرقی پاکستان
۴۔ مغربی پاکستان
۵۔ شیراز

بستی ''ناول درحقیقت یادداشتوں کے وسیع کینوس پر مشتمل ہے۔ اس ناول کے مکان شہر، درخت، آسمان، ستارے، باپ، ماں، عورتیں اور کتابیں غرض یہ کہ سب کے سب ایک لمحے یا چند لمحوں کے لیے اپنی جسامت اور حدود اربعہ کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں، مگر پھر فوراً ہی یادداشتوں سے اخذ کرتے ہیں۔ اور ان یادداشتوں کے بغیر کرداروں کا وجود برقرار نہیں رہتا۔ یادداشتوں کے اس وسیع کینوس میں کہیں آوازوں کی گونج سے نعرے اور یہ نعرے انسانی ذہنوں کے اندر اُتر کر رویے مرتب کرتے ہیں۔

یادیں اگر خوشگوار ہوں تو انسان کو خوشی اور راحت دیتی ہیں، لیکن اگر یہی یادیں ناخوشگوار ہوں تو انسان اذیت سے دو چار رہتا ہے۔ اگر انسان کا حال ماضی سے بہتر ہو تو انسان ان یادوں کو بھولنے لگتا ہے لیکن اگر حال ماضی سے بدتر ہو تو یادوں سے پیچھا چھڑوانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ''بستی'' ناول میں بھی اس چیز کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ پہلے ذاکر کے رہائشی علاقے روپ نگر میں طاعون کی وبا پھیلی اور اس کے باعث کتنے ہی گھرانوں کے چراغ گل ہوئے۔ ذاکر کے ماموں ابا نے انھیں لینے کے لیے بیلی بھی بھیجی، لیکن ابا جان نہ مانے اور کہا:

> ''بی اماں! حضور رسالت مآب نے فرمایا کہ جو موت سے بھاگتے ہیں وہ موت ہی کی طرف بھاگتے ہیں۔''(۷)

ذاکر کا گھرانہ بھی اماں کی وفات کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے لیکن یہاں انھیں وہ کچھ نہ مل سکا جس کی انھیں تلاش تھی۔ اس ہجرت کے دوران پیش آنے والی مشکلات کو انتظار حسین اپنے ایک کردار سفید بالوں والے شخص کی زبان میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''جب میں گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے، اسی وقت میری عمر ہی کیا تھی؟ بیس اکیس کے پیٹے میں تھا۔ جس پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے

سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا، پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔''(۸)

ایسے بہت سے خاندان تھے جو ہجرت کرتے ہوئے گھر سے نکلے، لیکن اپنی منزل پاکستان پہنچے تو انھیں یہاں پہنچ کر بھی مایوسی ہوئی، کیونکہ یہاں بھی وہی انتشار اور بدامنی کا ماحول ہے۔ اس ناول کا ایک کردار مولوی سلائی کا ہے، جو ماچس کی ادھ کھُلی ڈبیوں میں خود کو گم کیے رکھتا ہے۔ وہ یادوں کے جنگل میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ وہ ان خالی ڈبیوں کو مختلف بستیاں تصور کرتا ہے، جو کہ لوگوں کے جانے کے بعد خالی ہوگئی ہیں ان بستیوں کے اُجڑنے کے سبب اُسے چپ کروا دیا ہے۔ ''بستی'' اس ہجرت کا نوحہ ہے۔ انتظار حسین نے آزادی کے بعد اپنے آبائی وطن ہندوستان سے ہجرت کی اور پاکستان کے شہر لاہور میں رہائش اختیار کی۔ انور سدید ''بستی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بستی پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ انتظار حسین اپنے احساسات سرحد کے اس پار چھوڑ آئے اور اب جو وجود پاکستان کی سرزمین پر سانس لے رہا ہے، وہ محض استخوان ہے، جس کے ماتھے پر دو آنکھیں لگی ہوئی ہیں اور وہ سیاسی مدوجزر کو لیاقت علی خان کے قتل کو، مارشل لا کو اور پھر سقوطِ ڈھاکہ تک کے حالات کو دیکھ رہا ہے، لیکن وہ ایک بے بس انسان سے زیادہ نظر آتا ہے۔''(۹)

روپ نگر کا قصبہ جو ایک بھرپور پھلواری اور بچپن کے کھیلوں کا میدان تھا، مگر اب بجلی، لاریوں اور ٹرینوں کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ ویاس پور، میرٹھ اور دہلی اور اس کے بعد نئے وطن کا نیا شہر جو آنے والوں کے لیے ایک مہربان پناہ گاہ ثابت ہوا تھا، مگر جہاں کے نئے باسیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا نہیں سیکھا اور ہوائی اور زمینی خطروں کا ہیروذاکر ہے۔ وہ ماضی کے بے چین سکون کا متلاشی ہے، جس میں فطرت سے قربت شامل ہے۔ ذاکر روپ نگر اور بستی کو اپنے من میں سموئے ہے۔ مثلاً ایک اقتباس:

''میں اس شہر کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ سو کرتا ہوں، یہ میرے تصور میں آباد روپ نگر کے لیے دعا ہے کہ میں اسے اب اس شہر سے الگ کر کے تصور میں نہیں لا سکتا۔ روپ نگر اور شہر میرے اندر گھل مل کے ایک ''بستی'' بن گئے ہیں۔''(۱۰)

حافظہ اور یاداشت انتظار حسین کو ماضی کی طرف لوٹنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ گردوپیش کا ماحول ہے، وہ زمانہ جس میں وہ سانس لے رہے ہیں ان کے لیے کوئی کشش کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ اسے ۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی، بلکہ اس سے بھی صدیوں پہلے واقعہ کربلا کی نسبتوں سے دیکھتے ہیں ''بستی'' میں انسانی وجود کا مسئلہ ایک خاص کیفیت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب عرفان کی آواز ایک زوال پاتی ہوئی کائنات میں گونجتی ہے:

''اس سے پہلے کہ اس کی مانگ میں چاندی سی بھر جائے اور چڑیاں چپ ہو جائیں اور اس سے پہلے کہ چابیوں کو زنگ لگ جائے اور گلی کے کواڑ بند ہو جائیں اور اس سے پہلے کہ چاندی کی ڈوری کھولی جائے اور سونے کی کٹوری توڑی جائے اور گھڑا چشمے اور چندن کا پیڑ ساگر میں اور ساگر میں سانپ اور۔۔۔''(۱۱)

انتظار حسین کے ناول ''بستی'' (۱۹۴۷ء سے قبل اور ۱۹۴۷ء) میں ہجرت کا تجربہ پوری مستقل مزاجی کے ساتھ پینترے بدل بدل کر سامنے آیا ہے۔مگر وہ اپنے افسانوں میں دبے لفظوں میں جو بات کرتے تھے۔بالکل وہی بات،قدرے اس سے مختلف انداز میں ذرا بلند آواز میں کہی ہے۔یہ ناول اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں انتظار حسین کا نقطۂ نظر ایک نادیدہ امانت کی طرح قاری کی طرف منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ کھلے منظروں کی مانند سامنے بھی آیا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین کو بالعموم قنوطی کہا جاتا ہے،لیکن ''بستی'' میں اس کا زاویۂ نگاہ بدلا نظر آتا ہے کہ اس نے آخرنئی رت کی بشارت بھی دی ہے۔انتظار حسین کی ''بستی'' پر ایک اعتراض ناول کی تکنیک سے عدم توجہی کا بھی ہے۔ہمیں انتظار حسین کی جرات کی داد دینی چاہیے کہ اس نے ناول کی تکنیک کے اس فارمولے کو توڑ کر ناول لکھنے کی کوشش کی ہے۔''(۱۲)

انتظار حسین کا دوسرا ناول'' تذکرہ'' ۱۹۸۷ء میں منظرِ عام پر آیا،اس کی اشاعت پر ملا جلا ردِعمل سامنے آیا۔بعض قارئین و ناقدین نے اسے ''بستی'' کی توسیع قرار دیا ہے اور مصنف سے یہ گلہ کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہرانے لگا ہے۔مثلاً ڈاکٹر ممتاز احمد خان کا کہنا ہے:

> ''موضوع کے اعتبار سے اسے ناسٹلجیا ہی کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔اس میں ذاکر اخلاق کے روپ میں سامنے آتا ہے۔وہی سنجیدہ باوقار اور سوچ کے مرحلوں سے گزرنے والا کردار جو اپنی ماں ''بوجان'' کی انگلی تھامے لاہور کے گلی کوچوں میں کسی ایسے مکان کی تلاش میں ہے، جو ماضی کی جڑوں سے اتصالی کا سبب بن سکے۔''(۱۳)

تذکرہ میں ماضی،حال،اور مستقبل تینوں کا سنگم نظر آتا ہے،اس ناول کا ہر کردار بیک وقت تین زمانوں کا باسی ہے۔اور جملہ سطحوں پر ہمہ وقت موجود ہے۔اگر وہ کسی وجہ سے کسی ایک سطح پر ٹھہر جائے یا کسی وجہ سے محض ایک زمانے سے جڑ جائے تو گویا پتھر کا بن جائے۔''تذکرہ'' کا ہیرو اخلاق ایک وقت پر ایک مقام پر ہوتا ہے،لیکن بیٹھے بیٹھے ماضی کی گلیوں میں کھو جاتا ہے اور ماضی کے واقعات کا یاد کرنے لگتا ہے۔اخلاق کا کردار ماضی کی حسین یادوں میں بھی گرفتار ہے اور شریں کے ساتھ مل کر ان حسین یادوں کی باز آفرینی بھی کرتا ہے،مگر ساتھ ہی وہ ''چراغ حویلی'' اور اس کی بنیادوں میں دفن شدہ حویلیوں سے منسلک توہمات کو خندہ استہزا میں اُڑا رہا ہے۔مثلاً بوجان'' آشیانہ'' کے ذریعے ''چراغ حویلی'' کو زندہ رکھے ہوئے تھیں۔اسی لیے جب اخلاق کی بیوی زبیدہ نے ''آشیانہ'' بیچنے کی بات کی تو وہ سخت ناراض ہوگئیں اور یہی دکھ ان کو اندر سے دیمک کی طرح چاٹ گیا اور بالآخر:

> ''اس دن بھی چوکی پہ بیٹھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔میرے ساتھ ٹھیکدار کو گھر کے اندر آنے اور اندر باہر کا جائزہ لیتے دیکھا تو جیسے ہونٹ ایک دم سے سل گئے ہوں پورا جسم ساکت بس آنکھیں حرکت میں تھیں جیسے ٹھیکدار کی ہر حرکت کا تعاقب کر رہی ہوں۔''(۱۴)

انتظار حسین پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ناسٹلجیا کے مرض میں مبتلا ہیں اور وہ ہجرت سے جڑے اپنے اس تجربے سے باہر نہیں نکلے اس لیے یہ ناسٹلجیا ان کے ہاں جا بجا اپنی جھلک دکھاتا ہے،اس حوالے سے دیکھا جائے تو تذکرہ میں بھی جگہ جگہ ناسٹلجیا اپنی جھلک دکھاتا ہے،ناول کا ہر کردار اپنے ماضی میں ڈوبا نظر آتا ہے۔انتظار حسین کے کردار ماضی سے محبت کرتے ہیں،حال سے نفرت اور مستقبل سے خوف زدہ ہیں۔یہ ناول ایک ایسے شخص کی آپ بیتی ہے جس کی جڑیں کسی زمانے میں زمین

میں پیوست تھیں اور اب اُکھڑ چکی ہیں ''تذکرہ'' کا مرکزی نقطہ اور مرکزی موضوع ہجرت ہی ہے۔ جو نئے ملک میں کتنی دہائیوں کا عرصہ گزار لینے کے باوجود انتظار حسین کے ذہن و دل پر قابض ہے ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے ''تذکرہ'' یا ''نیا گھر'' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> ''تذکرہ ناسٹلجیائی تجربات کے تناظر میں ہمارے اُردو ناول کے لیے ایک نیک فال ہے۔ ''روپ نگر''، اور ''چراغ حویلی'' کو یاد کرنے والی بزرگ خاتون کا دور ''تذکرہ'' میں تمام ہوتا ہے۔ اب اخلاق اور زبیدہ کی نسل کو آگے آنا ہے کہ جن کا مسئلہ نہ ہجرت ہے نہ ہی ناسٹلجیا۔''(۱۵)

حوالہ جات

۱۔ قاضی جاوید، ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں، مشمولہ: ماہ نو، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص:۲۲۔۲۷

۲۔ انتظار حسین، اردو کا مختصر افسانہ پاکستان میں، مشمولہ: سیپ ۱۲، خاص نمبر، ص:۳۸۵

۳۔ احمد سہیل، اردو افسانے کا ناسٹلجیا، ملتان: تدوین پبلی کیشنز، ملتان، س ن، ص:۳۲۔۳۳

۴۔ انتظار حسین، علامتوں کا زوال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۳۳۷

۵۔ آصف فرخی، انتظار حسین گنی چنی تحریریں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص:۱۱۳

۶۔ ایضاً، ص:۸۷

۷۔ آصف فرخی، بستی (انتظار حسین سے گفتگو)، مشمولہ: سویرا، شمارہ ۸۵، لاہور، جولائی۔اگست ۲۰۰۷ء، ص:۱۵۔۱۶

۸۔ ارتضی کریم، ڈاکٹر، انتظار حسین ایک دبستان، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص:۱۰۲

۹۔ ایضاً، ص:۴۴

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۲

۱۱۔ ایضاً، ص:۲۲۶

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۴۹۰۔۴۹۴

۱۳۔ ممتاز احمد خان، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، کراچی: ویلکم بکڈپو، ۱۹۹۳ء، ص:۲۵۲۔۲۵۶

۱۴۔ ایضاً، ص:۲۲۶

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۶

☆.....☆.....☆